تفسیر کا دورِ اوّل

محمد سرور

تاریخ اسلام کی پہلی صدی میں، جیسا کہ گزشتہ دو مضامین میں بتایا جا چکا ہے، مسلمانوں کی سب سے زیادہ توجہ مذہبی امور کی طرف تھی۔ اور اس عہد میں زیادہ تر علوم دینی ہی کا چرچا رہا۔ اور ایسا ہونا بالکل فطری بھی تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کے دلوں پر مذہب کا اثر و نفوذ حدِ کمال کو پہنچ چکا تھا۔ پھر مذہب ہی ان کے لئے امت کا شیرازہ بند اور قومی و ملی عظمت کا سرچشمہ بھی تھا۔ اور روحانی اور دنیاوی جو نعمت بھی انہیں حاصل ہوئی تھی، وہ اسی کی بدولت تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر اسلام کا وجود مسعود سرزمین عرب میں جلوہ فرما نہ ہوتا، تو اہل عرب پہلے کی طرح قبیلوں اور گروہوں میں بٹے رہتے اور ان میں آپس میں بدستور لڑائیاں ہوتی رہتیں۔ وہ جزیرہ عرب کی حدود سے باہر نکلنے کے بجائے حسب سابق بدویانہ زندگی گزارتے اور اپنے ہی خیموں میں مگن رہتے۔ صحرا، اونٹ اور بکریاں ان کی کل کائنات ہوتی۔ اور کشور کشائی اور جہانگیری وہ کبھی خواب میں بھی نہ دیکھتے۔ یہ طبعی امر تھا کہ اہل عرب اسلام کو اپنی دنیاوی بہبود کی سب سے بڑی متاع اور اخروی سعادت کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے اور اس کی تعلیمات و احکام سے بہرہ ور ہونے میں لگ جاتے۔

اسی عہد میں عربوں کے علاوہ غیر عربوں نے بھی اسلام قبول کیا، اور وہ بڑے خلوص سے جوق در جوق اس دین میں شامل ہوئے۔ ان غیر عرب مسلمانوں کے دلوں میں بھی عرب مسلمانوں کی طرح اسلام کی صداقت اور حقانیت جاگزین تھی۔ اور اسلام سے عقیدت و شیفتگی میں یہ نو مسلم غیر عرب ان عربوں سے جو ان سے پہلے اسلام لا چکے تھے، کسی طرح پیچھے نہ تھے۔ ان فاتحین اور مفتوحین نے جب ایک ہی دین کے حلقہ بگوش تھے،

؎ ستمبر اور اکتوبر ۱۹۶۶ء کے شماروں میں یہ مضامین چھپے ہیں یہ مضمون بھی فجر الاسلام سے ماخوذ ہے۔ (محمد سرور)

© rasailojaraid.com

سب سے پہلے قرآن مجید کی طرف توجہ کی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی کو معلوم کرنے اور انہیں جمع کرنے کا ان کو شوق ہوا۔ صدر اسلام میں قرآن و حدیث کی نشر و اشاعت کے سلسلے کا یوں آغاز ہوتا ہے۔ آگے چل کر جب دولت اسلامیہ کا دائرہ وسیع ہوا، مختلف علاقے اور ان کے مختلف نسلوں اور مذاہب کے باشندے اس کے زیر تسلط آئے۔ ان سے مسلمانوں کا سابقہ ہوا۔ اور مسلمانوں کو نئے نئے حوادث اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ تو ان کا حل ڈھونڈنے کے لئے انہیں لامحالہ قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اور اس طرح ان سے پیش آمدہ مسائل کے حل استنباط کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس عہد میں دینی علوم کے علاوہ دوسرے علوم کی طرف کم توجہ کی گئی۔ اور اگر ان میں سے کسی علم کو کچھ فروغ ہوا بھی، تو وہ یوں کہ پہلے اسے دینی رنگ دیا گیا۔ اور اس کے لئے دینی حجت حاصل کرلی گئی۔ مثال کے طور پر حضرت عمر بن عبدالعزیز طب کی ایک کتاب کی اشاعت کے لئے کئی دن تک استخارہ کرتے رہے[1]

اس عہد میں غزوات، اسلامی فتوحات اور باہمی خانہ جنگیوں کے متعلق بھی روایات کے سلسلے کا آغاز ہوا۔

غرض اس دور میں مسلمانوں کے ہاں مذہبی سرگرمیوں کا تمام تر دارومدار ان تین چیزوں پر تھا۔ قرآن مجید اور اس کی تفسیر، احادیث نبوی اور ان کی روایت اور تالیف۔ اور نئے حوادث کے بارے میں جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں، قرآن اور حدیث سے ان کے جوابات کا استنباط۔

قرآن مجید

قرآن مجید تقریباً بائیس سال کے عرصہ میں مختلف آیات کی شکل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اس پوری مدت میں حوادث اور احوال کے مطابق آیات نازل ہوا کرتی تھیں۔ جب آپؐ کا انتقال ہوا، تو قرآن ایک مصحف میں جمع نہ ہوا تھا۔ وہ محفوظ تو تھا لیکن کاتبین وحی کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے متفرق کتبوں اور حفاظ کے سینوں میں۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں پہلی دفعہ قرآن جمع کیا گیا۔ لیکن ایک مصحف میں نہیں، بلکہ مختلف کتبوں کو جمع کردیا گیا۔ اور جو کچھ حفاظ کو یاد تھا، وہ لکھ لیا گیا

---

[1] وہ قرابادین جو عمر بن عبدالعزیزؒ نے شائع کی تھی، ایک روایت کے مطابق مروان کے زمانے سے خزانۂ
مکتب
میں محفوظ چلی آتی تھی۔

(تاریخ اسلام۔ بنی امیہ، شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ) (محمد سرور)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ مجموعہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس رکھا گیا ان کی وفات کے بعد یہ صحیفے حضرت عمرؓ کی تحویل میں آئے، اور ان سے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس پہنچے۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں قرآن کے ان صحائف کی کتابت و تدوین حضرت زید بن ثابت کی زیر نگرانی ہوئی تھی۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے دورِ خلافت میں اہل الرائے کے اصرار پر حضرت حفصہؓ سے قرآن کے وہ متفرق صحائف لے کر حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن زبیر، اور سعید بن عاص کے سپرد کئے۔ اور اس طرح وہ سب ایک مصحف کی شکل میں مدون کر دیئے گئے۔ پھر اس مصحف کے متعدد نسخے کر اکے مختلف شہروں میں بھجوا دیئے گئے۔ اور اس متفق علیہ مصحف کے خلاف بعض افراد کے پاس اس قسم صحائف جو کچھ تھا انہیں جلا دیا گیا۔

قرآن اہل عرب کی زبان اور ان کے اسلوب کلام اور محاورے کے مطابق نازل ہوا۔ اس کے الفاظ عربی ہیں سوائے قلیل التعداد الفاظ کے، جو معرّب ہیں اور دوسری زبانوں سے لئے گئے ہیں، لیکن اہل عرب نے ان اجنبی الفاظ کو اپنا لیا تھا، اور ان پر عربی زبان کے قواعد نافذ ہوتے تھے۔ قرآن کا اسلوبِ بیان اہل عرب کے اسلوب کے مطابق ہے۔ اسی کی طرح اس میں مجاز، کنایہ اور دوسری اصنافِ سخن کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اور چاہیئے بھی یہی تھا۔ کیونکہ اس کے سب سے پہلے مخاطب عرب تھے۔ اس لئے اس کا اُن کی زبان میں اور ان کے اسلوب بیان کے مطابق ہونا لازمی تھا۔ خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ وما ارسلنا من رسولٍ الاّ بلسان قومہ لیبیّن لھم (اور ہم نے رسولوں میں سے کسی کو نہیں بھیجا لیکن اس کی قوم کی زبان میں تاکہ وہ ان سے صاف صاف بات کہہ سکے)

قرآن کے عربی زبان میں اور عربوں کے اسلوب بیان کے مطابق ہونے کے یہ معنی نہیں ہے کہ تمام کے تمام صحابہ قرآن کا ہر ایک حصہ سننے کے ساتھ ہی اس کے سارے مطالب سمجھ جاتے تھے۔ ہمیں ابن خلدونؒ کے اس قول کے آخری حصہ تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ "قرآن اہل عرب کی زبان اور ان کے اسلوب بیان کے مطابق نازل ہوا۔ اور وہ تمام کے تمام اس کو سمجھتے اور اس کے مفردات اور اس کی ترکیبوں کے معانی کو جانتے تھے"۔ ہمارے خیال میں قرآن کے عربی زبان میں نازل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام اہل عرب اس کے مفردات اور ترکیبوں پر حاوی تھے۔ اس کی دلیل ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔

لہ مقدمہ ص ۳۶۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی زبان میں ایک کتاب کا ہونا اس امر کا مترادف نہیں ہوتا کہ تمام اہل زبان اسے سمجھتے ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی زبان میں کتنی کتابیں ہیں، جو خود انگریز اور فرانسیسی نہیں سمجھتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک کتاب کو سمجھنے کے لئے صرف اس کی زبان جاننے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اس کتاب کے علمی معیار کے مطابق استعداد عقلی[1] کا ہونا ضروری ہے۔ یہی حال قرآن کے بارے میں اکثر اہل عرب کا تھا۔ وہ سارے کے سارے پورے قرآن مجید کو سمجھنے پر قادر نہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی استعداد اور ذہانت کے مطابق اس علم لدنی سے بہرہ ور ہوتا تھا۔ بلکہ ہماری رائے میں اہل عرب میں سے ہر فرد قرآن کے تمام الفاظ کے معانی سے بھی آگاہ نہ تھا۔ جیسا کہ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ قوم کا ہر فرد اس قوم کی زبان کے تمام الفاظ کے معانی پر عبور رکھتا ہے۔

مزید ثبوت کے لئے حضرت انس بن مالک کی ایک روایت ملاحظہ ہو:۔ آپ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے "وفاکھتہ وابا[2]" میں "ابا" کے معنی پوچھے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تکلف اور تعمق سے منع فرمایا ہے۔ نیز حضرت عمرؓ سے ایک اور روایت ہے کہ آپ نے منبر سے یہ آیت پڑھی۔ "او یأخذھم علی تخوف[3]" اور تخوف کے معنی دریافت کئے۔ بنی ہذیل میں سے ایک شخص نے کہا کہ "تخوف" ہمارے ہاں تنقص کو کہتے ہیں اور پھر یہ شعر پڑھا۔

---

[1] مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے تھے کہ بعثت نبویؐ کے وقت مکہ اور کسی حد تک مدینہ بین الاقوامی شہر تھے اور ان کی ذہنی فضا کافی ترقی یافتہ تھی چنانچہ قرآن مجید ان دونوں شہروں کے اہل عقل و رائے کے لئے بالکل قابل فہم تھا باقی یہ کہنا کہ عرب کے ہر بدو کی جس کی عربی زبان تھی قرآن کے اعلیٰ و دقیق معانی تک رسائی تھی، صحیح نہیں۔ (محمد سرور)

[2] فاکھتہ میوے۔ ابّاً چارہ۔ الابّ اس گھاس کو کہتے ہیں، جو جانوروں کے چرنے اور کاٹنے کے لئے بالکل تیار ہو۔ (مفردات القرآن اردو ترجمہ از مولانا محمد عبدہ)

[3] او یأخذھم علی تخوف۔ یا جب ان کو عذاب کا ڈر پیدا ہو گیا ہو، اس وقت پکڑ لے (مفردات القرآن اردو ترجمہ) نیچے حاشئے میں ہے۔ یہاں فراء نے تخوف کے معنی تنقص ہی لئے ہیں، جیسا کہ مصنف نے تخوفنا کا محاورہ پیش کیا ہے۔ مگر زجاج نے اس کے معنی اضافہ کئے ہیں۔ ملاحظہ ہو لسان العرب خ و ف۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تخوف الرحل منها تامکا قرداً
کما تخوف عود النبعة السفن

حضرت عمرؓ کی علم اور دین میں جو منزلت ہے، وہ دیکھئے اور پھر یہ روایت بھی ملاحظہ کیجئے[1] بات یہ ہے کہ صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد آیات کے صرف اجمالی معنوں پر اکتفا کیا کرتی تھی اور الفاظ کی تحقیق اور ان کے معانی کی تفصیل میں زیادہ نہیں جاتے تھے۔ مثلاً وہ آیت "وفاکھۃ وابّاً" سے مراد لیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں کا ذکر کر رہا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید میں بہت سی آیات ایسی ہیں کہ جن کو سمجھنے کے لئے زبان کے الفاظ اور اس کے اسالیب کا جاننا کافی نہیں۔ مثلاً "والعادیات ضبحاً۔ والذاریات ذرواً۔" اور یہ کہ آیت "والفجر ولیالٍ عشر" میں لیالٍ عشرٍ یعنی دس راتوں سے کیا مراد ہے۔ "وانزلناہ فی لیلۃ القدر" سے کون سی رات مراد ہے۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔ نیز قرآن مجید میں تورات اور انجیل کی بہت سی چیزوں کی طرف اشارے ہیں اور عیسائیوں اور یہودیوں کا رد کیا گیا ہے۔ ان کے سمجھنے کے لئے بھی صرف زبان کی معرفت کافی نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

هو الذی انزل علیك الكتاب منه آیاتٌ محكماتٌ هن ام الكتاب واُخرُ متشابهاتٌ فاما الذین فی قلوبهم زیغٌ فیتبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة وابتغاء تاویله وما یعلم تاویله الا الله والراسخون فی العلم یقولون امنا به كل من عند ربنا (وہی ہے جس نے نازل کیا تم پر کتاب کو، جس میں کا ایک حصہ وہ آیتیں ہیں جو کہ اشتباہِ مراد سے محفوظ ہیں اور یہی آیتیں اصلی مدار ہیں کتاب کا اور دوسری آیتیں ایسی ہیں جو کہ مشتبہ المراد ہیں، سو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، وہ اس کے اسی حصہ کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ جو مشتبہ المراد ہے۔ شورش ڈھونڈنے کی غرض سے اور اس کا مطلب ڈھونڈنے کی غرض سے۔ حالانکہ اس کا مطلب بجز حق تعالیٰ کے کوئی اور نہیں جانتا۔ اور جو لوگ

---

[1] یہ دونوں روایتیں کتاب الموافقات ج ۲ ص ۵۷ ص ۵۸ مطبوعہ مصر میں ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علم میں پختہ ہیں، وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم اس پر یقین رکھتے ہیں سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے)[1]

حاصل یہ ہے کہ یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ فہم قرآن اور معرفت معانی قرآن کے معاملے میں صحابہ کے

افراد استعداد کے مختلف مدارج تھے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں تمام قرآن حفظ کرنے کا رواج، جیسا کہ بعد میں عام ہوا، نہیں تھا۔ صحابہ ایک سورت یا چند آیتیں حفظ کرتے اور ان کے مطالب سمجھتے، جب اس میں کما حقہٗ درک ہو جاتا، تو پھر آگے بڑھتے۔ اس طریقے سے کئی صحابہ مل کر قرآن کے حافظ ہوتے تھے، ابو عبدالرحمٰن السلمی کا بیان ہے کہ عثمان بن عفان اور عبداللہ بن مسعود وغیرہم ایسے قرآن پڑھنے والوں نے ہم سے ذکر کیا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیات پڑھتے اور جب تک وہ یہ جان لیتے کہ ان میں علم و عمل کیا ہے، وہ ان سے آگے نہ بڑھتے۔ حضرت انس کہتے ہیں کہ ہم سے جو شخص سورۂ بقرہ اور سورہ آلِ عمران پڑھ لیتا، اس کی قدر و منزلت ہماری نظروں میں بہت بڑھ جاتی (امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں اس کی روایت کی ہے) عبداللہ بن عمر نے سورۂ بقرہ حفظ کرنے پر آٹھ سال لگائے۔[2] ایک آیت یاد کرتے اور اس کے معانی اور مطالب سمجھتے پھر آگے بڑھتے۔

تفسیر کی ضرورت کیوں پیش آئی

قرآن میں بہت سی آیات محکمات میں سے ہیں اور ان کا مطلب صاف و واضح ہے۔ ان میں دین کے اصول اور احکام بیان کئے گئے ہیں۔ خاص طور سے مکی آیات میں اصول دین کی دعوت دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر سورہ الانعام کو لیجئے اس قسم کی آیات کا عوام الناس کے لئے اور خاص طور سے وہ جو عرب ہوں، سمجھنا زیادہ دشوار نہیں۔ ان کے علاوہ قرآن میں غامض آیات بھی ہیں، جنہیں تشابہات کہا گیا ہے ان کا سمجھنا مشکل ہے، اور خواص ہی ان کے کنہہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ صحابہ کرام بالعموم فہم قرآن کی تمام لوگوں سے زیادہ صلاحیت رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ ان کی زبان میں اترا تھا۔ نیز وہ ان احوال اور حوادث کے عینی شاہد تھے، جن کے بارے میں آیات نازل ہوتی تھیں اس کے باوجود پھر بھی فہم قرآن کے متعلق ان میں

---

[1] ترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ہے۔ (محمد سرور)

[2] الاتقان جزو ۲ صفحہ ۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی اپنی استعداد کے اعتبار سے مختلف مدارج تھے مثلاً۔

۱۔ اس میں شک نہیں کہ تمام صحابہ کی زبان عربی تھی، لیکن عربی زبان جاننے کے معاملے میں بھی ان میں تفاوت تھا۔ ان میں سے بعض ادب جاہلی سے زیادہ واقف تھے اور غیر مانوس اور مشکل الفاظ سمجھتے تھے۔ اس سے وہ فہم قرآن میں مدد لیتے۔ اور بعض ایسے تھے، جو اس میں ان سے پیچھے تھے

۲۔ بعض صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ شرف صحبت ملا۔ اور وہ آپؐ کی حضوری اور رفاقت میں اوروں سے زیادہ عرصہ رہے۔ اس کی وجہ سے وہ آیات کی شان نزول سے زیادہ واقف تھے اور دوسرے اس نعمت سے محروم رہے۔ آیات کے مطالب سمجھنے کے لئے شان نزول سے غیر معمولی مدد ملتی ہے۔ اور اس کے نہ جاننے سے لغزشوں کا احتمال رہتا ہے۔ مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے قدامہ بن مظعون کو بحرین کا عامل مقرر کیا۔ جارودؓ نے حضرت عمرؓ سے آکر شکایت کی کہ قدامہ نے شراب پی، اور اسے نشہ بھی ہوا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو، اس کا کوئی گواہ ہے۔ جارودؓ نے ابو ہریرہؓ کا نام لیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ قدامہ! میں تمہیں کوڑے لگاؤں گا۔ قدامہ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم اگر میں نے شراب پی ہے، جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں، تو تمہیں مجھے کوڑے لگانے کا کوئی حق نہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ یہ کیوں؟ قدامہ نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی۔

"لیس علی الذین آمنوا وعملوا الصالحات جناح" فیما طعموا اذا ما اتقوا وآمنوا وعملوا الصالحات ثم اتقوا وآمنوا ثم اتقوا واحسنوا" [1]

اور کہا کہ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں۔ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کئے۔ پھر وہ اللہ سے ڈرے اور ایمان لائے اور پھر وہ اللہ سے ڈرے اور انہوں نے اچھے کام کئے۔ نیز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدر، احد، خندق اور دوسرے معرکوں میں شریک ہوا یہ سن کر

---

[1] ترجمہ، ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے، جو کچھ انہوں نے کھایا اس پر کوئی گناہ نہیں جب کہ وہ اللہ سے ڈرے اور ایمان لائے اور نیک کام کئے۔ پھر اللہ سے ڈرے، اور ایمان لائے۔ پھر اللہ سے ڈرے اور اچھے کام کئے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ تم میں سے کوئی اس کا جواب دیتا ہے۔ ابن عباس نے کہا کہ یہ آیات گزشتہ را صلوٰۃ اور آئندہ را احتیاط کا حکم رکھتی ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے۔ "یا ایھا الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان[1]"

حضرت عمر کہنے لگے کہ تو نے صحیح کہا۔

ایک اور روایت ہے کہ ایک آدمی ابن مسعود کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے مسجد میں ایک آدمی کو دیکھا ہے، جو قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کر رہا تھا۔ وہ اس آیت کی "یوم تاتی السماء بدخان مبین" تفسیر یوں کرتا ہے کہ قیامت کے دن آدمیوں پر دھواں چھا جائے گا اور ان کے دم گھٹنے لگیں گے، اور ان کو زکام کا سا ہو جائیگا۔ یہ سن کر ابن مسعودؓ نے کہا۔ جو علم رکھتا ہو، وہ کہے اور جو علم نہیں رکھتا ہو اسے یہ کہنا چاہیے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی چنانچہ آپ نے ان کے لئے حضرت یوسفؑ جیسے قحط کی بد دعا کی، آخر ان کو قحط نے آگھیرا اور ان کا یہ حال ہو گیا کہ وہ ہڈیاں تک کھا گئے۔ ہوتا یہ تھا کہ جب ان میں سے کوئی آدمی آسمان کی طرف نظر کرتا تو وہ اپنے اور آسمان کے درمیان بھوک کی شدت کی وجہ سے دھواں جیسا دیکھتا۔

۳۔ اہل عرب کے اپنے اعمال اور اقوال میں جو مختلف عادات و اطوار تھے، ان سے بعض صحابہ زیادہ واقفیت رکھتے تھے اور بعض کم۔ اور اس بارے میں ان میں تفاوت پایا جاتا تھا۔ وہ صحابہ جو ایام جاہلیت کی رسومات حج سے زیادہ باخبر ہوتے وہ حج سے متعلق آیات کو ان صحابہ سے جو رسومات حج سے ناواقف تھے، زیادہ بہتر طریقے سے سمجھتے۔ علیٰ ہذا القیاس ان آیات کو جن میں عرب کے معبودان باطل اور ان کے طریقہ عبادت کی مذمت کی گئی ہے۔ وہی پوری طرح سمجھ سکتا تھا، جو یہ جانتا تھا کہ وہ کیا کرتے تھے۔

۴۔ اسی طرح نزول قرآن کے دوران جزیرۂ عرب میں بسنے والے یہود اور نصاریٰ جو کچھ کرتے

---

[1] (ترجمہ) اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے، اس کا جاننا بھی فہم قرآن میں مدد دیتا تھا۔ کیونکہ قرآن میں ان کے اعمال کی طرف بھی اشارے ہیں، اور ان کا رد کیا گیا ہے، چنانچہ ان سے متعلق آیات کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ یہود اور نصاریٰ کیا کرتے تھے۔ غرض یہ اور اس طرح کے دوسرے اسباب تھے، جن کی وجہ سے قرآن مجید کے سمجھنے میں صحابہ میں فرقِ مراتب پایا جاتا تھا۔ اور ان کے بعد جب تابعین کا دور آیا، تو ان میں اور بھی زیادہ فرقِ مراتب پیدا ہو گیا۔

تفسیر کے ماخذ

تفسیر کی ایک شق تفسیر بالمنقول ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ آیات کی وہ تفسیر یا تشریح جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمائی۔ مثلاً آپؐ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا الصلوٰۃ الوسطیٰ سے مراد عصر کی نماز ہے۔ اسی طرح حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یوم الحج الاکبر کے متعلق دریافت کیا، تو آپؐ نے فرمایا فرمایا کہ وہ قربانی کا دن ہے۔ نیز مروی ہے کہ آپؐ سے پوچھا گیا کہ حضرت موسیٰؑ نے کون سی مدت پوری کی تھی[۱]۔ آپؐ نے فرمایا، جو دونوں مدتوں میں زیادہ بہتر تھی۔ اس قسم کی بہت سی روایات آپؐ سے مروی ہیں، جو صحاح ستہ میں مذکور ہیں۔ ان پر قصہ گوؤں اور جعلی احادیث گھڑنے والوں نے بھی بہت کچھ اضافہ کر دیا ہے، علمائے حدیث نے ان سب روایات کی چھان بین کی۔ چنانچہ بعض کو تو انہوں نے صحیح مانا اور بعض کو ضعیف قرار دیا۔ اس بارے میں گھڑی ہوئی روایات کے دخل پا جانے کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ ہمیں ایک ہی آیت کی دو متناقض تفسیریں ملیں گی، جن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صدور ناممکن ہے۔ جیسا کہ مثال کے طور سے حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے اس قول "والقناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ" کی بابت پوچھا گیا۔ تو آپؐ نے فرمایا قنطار ایک ہزار اوقیہ کا ہوتا ہے، اور حضرت ابوہریرہؓ سے

---

[۱] اشارہ ہے حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ کے قصے کی طرف جس میں حضرت شعیب نے آخرالذکر سے اپنے ساتھ ایک خاص مدت (اجل) گزارنے کا فرمایا تھا۔
(سورۃ قصص ۲۸)

© rasailojaraid.com

روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قنطار بارہ ہزار اوقیہ کا ہوتا ہے۔[1] اسی لئے بعض علماء نے تفسیر کے بارے میں تمام روایات کا انکار کیا ہے۔ یعنی اس بارے میں جو روایات مروی ہیں وہ ان کی صحت تسلیم نہیں کرتے۔ امام احمد بن حنبل سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا تین چیزیں ہیں، جن کی کوئی اصل نہیں۔ تفسیر، جنگوں اور مغازی کی روایات[2]۔ اس باب میں جو روایات وارد ہوئی ہیں، ان پر خود مفسرین کے اعتماد نہ کرنے کی دلیل ہے کہ وہ ان وارد شدہ روایات پر رُکے نہیں، بلکہ انہوں نے ان روایات پر اپنے اجتہاد سے اضافہ کیا۔ اب اگر یہ تفسیری روایات ان کی نظر میں صحیح ہوتیں، تو وہ ان کی نصوص کی حدود پر رک جاتے۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، اس منقول تفسیر کا ذخیرہ بڑھتا گیا۔ اور اس میں صحابہ اور تابعین سے مروی شدہ روایات بھی داخل ہوتی گئیں۔ چنانچہ عہد اول کی مؤلفہ کتب تفسیر اس نوع کی تفسیر پر مشتمل ہیں

۲۔ تفسیر کے ماخذوں میں سے ایک ماخذ اجتہاد ہے۔ یا اسے دوسرے لفظوں میں "رائے" کہہ لیجئے۔ مثلاً مفسر کلام عرب اور ان کے اسالیب بیان سے واقف ہے۔ وہ عربی الفاظ اور ان کے معانی سے جیسا کہ وہ شعر جاہلی وغیرہ میں وارد ہوئے ہیں، باخبر ہے پھر آیات کی شان نزول کے بارے میں جن روایات کو وہ صحیح سمجھتا ہے۔ ان کا علم رکھتا ہے۔ وہ تفسیر میں ان اسباب سے مدد لیتا ہے۔ اور اپنے اجتہاد سے تفسیر کرتا ہے۔ بہت سے صحابہ آیات قرآنی کی اس طرح تفسیر کرتے تھے۔ چنانچہ ابن عباس اور ابن مسعود سے تفسیر کی جو روایات مروی ہیں، ان میں سے اکثر اس قبیل کی ہیں۔

مثال کے طور پر اللہ تعالےٰ کے اس ارشاد واذ اخذنا میثاقکم ورفعنا فوقکم الطور میں جو "الطور" آیا ہے، مفسرین نے اس کے کئی معنی کئے ہیں۔ مجاہد کے نزدیک "الطور" سے مراد مطلق پہاڑ ہے۔ ابن عباس اس سے ایک خاص پہاڑ مراد لیتے ہیں۔ اور انہی کا قول ہے کہ جس پہاڑ

---

[1] پہلی حدیث کی تخریج الحاکم نے اور دوسری کی امام احمد و ابن ماجہ نے کی۔

[2] الاتقان جزو ۲ ص ۲۱۱۔ منقول ہے کہ اصحاب امام احمد میں سے محققین کا قول ہے کہ امام احمد کی اس سے مراد یہ ہے کہ اس قبیل کی روایتوں کے غالب حصے کی صحیح متصل اسناد نہیں ہیں۔

© rasailojaraid.com

پر رد ئیدگی ہو، وہ "المطوّر" ہے اور جہاں رد ئیدگی نہ ہو وہ "المطوّر" نہیں۔ تفسیر میں اس طرح کا اختلاف "رائے" میں اختلاف کا نتیجہ ہے، روایات منقولہ میں اختلاف کا نتیجہ نہیں۔ اسی طرح الفاظ کے معانی میں اختلاف سے آیات کے معانی میں اختلاف ہوا۔

غرض تفسیر کے سلسلے میں صحابہ اور تابعین کی دو جماعتیں ہوگئیں۔ ایک جماعت قرآن کی تفسیر میں اپنی رائے دینے سے مطلقاً گریز کرتی۔ جیسا کہ سعید بن المسیب سے مروی ہے کہ جب ان سے قرآن کے بارے میں کچھ پوچھا جاتا، تو آپ فرماتے "قرآن میں میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا"۔ ابن سیرین کہتے ہیں کہ میں نے عبیدہ سے قرآن کے بارے میں کچھ پوچھا، تو انہوں نے جواب دیا۔ "اللہ سے ڈرو اور راستی کو لازم پکڑو۔ وہ لوگ گزر گئے جو جانتے تھے کہ قرآن کی فلاں آیت کس بارے میں نازل ہوئی ہے"۔ ہشام بن عروہ بن زبیر سے روایت ہے کہ میں نے اپنے والد کو کتاب اللہ کی کسی آیت کی "تاویل" کرتے نہیں سنا۔ لیکن اس جماعت کے پہلو بہ پہلو دوسری جماعت بھی تھی۔ جو اسے جائز سمجھتی تھی۔ بلکہ ان کے نزدیک اس سلسلے میں جن مطالب تک ان کا اجتہاد پہنچتا تھا، انہیں چھپانا علم کو چھپانا تھا۔ یہ جماعت تعداد میں کافی تھی۔ ابن مسعود، ابن عباس اور عکرمہ وغیرہم اسی رائے کے تھے البتہ یہ اور ان کے ہم خیال لوگ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ کوئی شخص استعداد رکھے بغیر تفسیر کرنے لگے۔ یعنی اسے کلام عرب پر اتنا عبور نہ ہو کہ وہ اسے صحیح طرح سمجھ سکے۔ یا اس نے قرآن کا اس قدر مطالعہ نہ کیا ہو کہ وہ اس کی اجمالی باتوں کو، ان باتوں پر جن کا ذکر تفصیل سے ہے، حمل نہ کر سکے۔ اسی طرح وہ اس کو بھی ناپسند کرتے تھے کہ ایک شخص مثال کے طور پر معتزلہ، مرجئہ اور شیعہ عقائد میں سے کسی ایک کو مان لے، اور اسے اصل اساس بنا کر اس کے مطابق قرآن کی تفسیر کرنے لگے۔ واجب تو یہ ہے کہ عقیدہ قرآن کے تابع ہو، نہ کہ قرآن کسی خاص عقیدے کے تابع۔

یہی اجتہاد تھا جو سبب بنا صحابہ اور تابعین میں قرآن کے الفاظ اور اس کی آیات کی تفسیر کے بارے میں واضح اختلاف کا، جسے آپ ابن جریر الطبری کی تفسیر کے ہر صفحے پر دیکھ سکتے ہیں۔

ادب جاہلی اور اس کا شعری اور نثری سرمایہ، دورِ جاہلیت اور صدر اسلام میں عربوں کی عادات اور ان کے حالات و وقائع، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ رسالت کے سلسلے میں جو دشمنی، مخالفت ہجرت، جنگوں اور فتنوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اور اس دوران میں جو اور واقعات ہوئے۔ وہ مقتضی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوئے کہ ان کے متعلق احکام نازل ہوں اور قرآن کی آیات اتریں۔ چنانچہ یہ سب چیزیں صحابہ وتابعین میں سے جو اہل علم تھے، ان کے لئے مصدر و ماخذ بنیں کہ وہ ان سے تفسیر میں مدد لیں

۴۔ مذکورہ بالا ماخذوں کے علاوہ تفسیر کا ایک اور ماخذ بھی تھا، جس سے مفسرین نے کافی فائدہ اٹھایا۔ ذہنوں کو تفصیلات معلوم کرنے اور بات کی تہ میں بہت دور تک جانے کا جو شغف اور میلان ہوتا ہے، اس کے تحت جب قرآن کی بہت سی آیتیں سنی جاتی تھیں، تو ان کے بارے میں طرح طرح کے سوالات پوچھے جاتے۔ مثلاً جب انہوں نے اصحاب کہف کے کتے کا قصہ سنا، تو کہنے لگے کہ اس کا رنگ کیا تھا، یا جب یہ آیت "فقلنا اضربوہ ببعضھا" سنی تو پوچھنے لگے کہ وہ "بعض" چیز کیا تھی۔ جس سے مارنے کا حکم دیا گیا۔ نوح کے سفینہ کی جسامت کیا تھی، اس لڑکے کا نام کیا تھا، جسے حضرت موسیٰ کے قصے میں "العبد الصالح" نے قتل کر دیا تھا۔ جب ان کے سامنے آیت "فخذ اربعۃ من الطیر" پڑھی گئی، تو سوال کیا کہ وہ کون سے پرندے تھے۔ اور وہ کون سے کواکب تھے، جو حضرت یوسف نے خواب میں دیکھے تھے۔ اسی طرح جب انہوں نے حضرت شعیب و حضرت موسیٰ کے قصے کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا "فلما قضیٰ موسیٰ الاجل" تو پوچھا کہ اجلین (دو مدتوں) میں سے یہ کون سی اجل (مدت) تھی۔ پھر یہ کہ حضرت موسیٰ نے حضرت شعیب کی بڑی لڑکی سے شادی کی تھی یا چھوٹی سے وغیرہ وغیرہ۔ ایسے ہی جب وہ قرآن میں سے ابتدائے آفرینش کی طرف اشارہ سنتے تو باقی کی تفصیل جاننا چاہتے۔ جب ان کے سامنے کوئی ایسی آیت پڑھی جاتی جس میں کسی نبی کے واقعہ کا ذکر ہوتا۔ تو انہیں اس کی تفصیل معلوم کئے بغیر اطمینان نہ ہوتا۔ اب ان سب خواہشات کی تسکین تورات اور اس پر جو حاشیئے لکھے گئے تھے، نیز اس ضمن میں اس میں جو قصے کہانیاں (اساطیر) داخل ہو گئی تھیں، ان سے ہوتی تھی۔ ان یہود میں سے بعض دائرہ اسلام میں بھی داخل ہوئے۔ اور ان سے اس طرح کی بہت سی باتیں مسلمانوں میں بھی منتقل ہوئیں۔ پھر یہی باتیں تفسیر قرآن میں داخل ہو گئیں، جن کی مدد سے شرح و تفصیل کی تکمیل کی جانے لگی اور ابن عباس جیسے کبار صحابہ نے بھی ان باتوں کو لینے سے احتراز نہ برتا۔

بے شک یہ روایت بھی ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "اہل کتاب کی باتوں کی تصدیق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرو، اور نہ ہی انہیں جھٹلا دو"۔ لیکن عمل اس کے خلاف ہوا۔ وہ ان باتوں کی تصدیق کرتے تھے اور ان سے نقل کرتے تھے۔ اگر اس کی مثال چاہیئے تو طبری وغیرہ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد "ھل ینظرون الا ان یاتیھم اللہ فی ظلل من الغمام والملائکۃ" کی جو تفسیر ہے وہ پڑھیئے۔ بیان کیا جاتا ہے ابن عباس کعب الاحبار کی مجلس میں بیٹھتے تھے اور اس سے روایت لیتے تھے۔

اس بارے میں مجھے ابن خلدون کی رائے پسند ہے۔ وہ کہتا ہے "اہل عرب اصحاب کتاب و علم نہ تھے ان پر بدویت اور امیت (ان پڑھ ہونا) کا غلبہ تھا۔ جب انہیں ابتدائے آفرینش کے اسرار اور موجودات کی تخلیق کے اسباب معلوم کرنے کا اشتیاق ہوتا، جیسا کہ انسانی نفوس کو اشتیاق ہوا کرتا ہے۔ تو وہ ان کے بارے میں اہل کتاب سے پوچھتے، اور ان سے استفادہ کرتے۔ یہ اہل کتاب یا تو یہودی تھے، جن کے پاس تورات تھی، یا نصاریٰ تھے۔ یہ اہل تورات یہودی جو اس وقت عربوں کے درمیان آباد تھے۔ انہیں کی طرح بادیہ نشین تھے۔ اور تورات اتنی ہی جانتے تھے، جتنی اہل کتاب میں سے عام لوگ جانتے ہیں۔ ان میں سے اکثر عربوں کے قبیلہ حمیر میں سے تھے، جنہوں نے یہودیت قبول کر لی تھی۔ جب یہ اسلام لائے، تو وہ ان باتوں پر، جو ان کے ہاں تھیں اور ان کا احکام شرعیہ سے جن کے بارے میں وہ محتاط تھے، تعلق نہ تھا، قائم رہے جیسے کہ ابتدائے آفرینش، گزشتہ حوادث، جنگوں اور ایسے ہی امور کے بارے میں روایات۔ یہی وہ امور تھے، جن کے بارے میں کعب الاحبار، وھب بن منبہ، عبداللہ بن سلام اور ان جیسے دوسرے لوگوں سے نقل کی ہوئی روایات تفاسیر میں جمع ہو گئیں۔ ان روایات کا سرچشمہ یہی لوگ تھے اور چونکہ ان روایات کا اسلام کے احکام سے کوئی تعلق نہ تھا کہ ان کی صحت کی جانچ پڑتال ہوتی اور ان پر عمل کرنا ضروری ہوتا۔ اس لئے ان کے معاملے میں مفسرین نے نرمی برتی اور اپنی کتب تفسیر میں ان کی نقل کی ہوئی روایات کو بھرتے چلے گئے"[1] الخ

اس عہد کے مفسر

صحابہ کرام کی ایک قلیل تعداد تفسیر بالرائے میں مشہور ہوئی ان میں جن سے اس بارے میں زیادہ روائیتیں کی گئیں، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب ہیں

---

[1] مقدمہ ص ۳۶۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ان کے بعد زید بن ثابت، ابو موسیٰ اشعری اور عبداللہ بن زبیر ہیں۔ اس جگہ ہم صرف اوّل الذکر چاروں کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ یہی وہ بزرگ ہیں، جنہوں نے مختلف بلاد اسلامیہ میں سب سے بڑھ کر تفسیر کی نشوونما کی۔ وہ صفات عامہ جن کی بدولت ان چاروں کو تفسیر میں تبحر حاصل تھا، وہ یہ تھیں۔ عربی زبان پر قدرت اور اس کے اسالیب پر عبور، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے صحبت، جس کی وجہ سے وہ ان حالات وواقعات سے واقف تھے، جن کے بارے میں آیات اتریں۔ پھر ان کا اجتہاد سے احتراز نہ کرنا، اور جو نتائج اجتہاد سے نکلیں ان کا اقرار و اثبات۔ اس معاملے میں ان چاروں میں سے صرف ابن عباس مستثنیٰ ہیں۔ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ صحبت میسر نہیں آئی، لیکن اس کی تلافی اہل علم صحابہ کی صحبت سے ہو گئی، ان سے ابن عباس نے استفادہ کیا، اور ان سے روایات بھی کیں۔

ان چاروں سے جو روایات مروی ہیں، اگر ان روایات کی کثرت کے اعتبار سے ہم ان بزرگوں کی درجہ بندی کریں، تو ابن عباس سب سے پہلے ہیں۔ پھر عبداللہ بن مسعود اس کے بعد علی بن ابی طالب اور پھر ابی بن کعب ہیں۔ یہ درجہ بندی کثرتِ روایات کے اعتبار سے ہے نہ کہ صحتِ روایات کے لحاظ سے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباس اور حضرت علی کی طرف اوروں سے کہیں زیادہ موضوع روایات منسوب کی گئی ہیں۔ اور اس کے کئی اسباب ہیں۔ اہم ترین سبب یہ ہے کہ حضرت علی اور حضرت ابن عباس خاندان نبوت سے تھے۔ اور ان کی طرف موضوع روایات منسوب کرنے سے دوسروں کی طرف منسوب کرنے کے مقابلہ میں زیادہ تقدس اور اعتماد پیدا ہوتا تھا۔ اور ایک سبب یہ بھی تھا کہ حضرت علی کے جتنے حمایتی (شیعہ) تھے، اتنے کسی اور کے نہیں تھے۔ چنانچہ ان کے نزدیک جو چیزیں حضرت علی کے علمی مرتبے کو بلند کر سکتی تھیں، وہ انہیں وضع کر کے حضرت علی سے منسوب کرنے لگے۔ ابن عباس کی نسل سے عباسی خلفاء تھے، ان کا تقرب حاصل کرنے کے لئے ان کے جدِ اعلیٰ (ابن عباس) سے بکثرت روایات کی جانے لگیں۔ اگر آپ اس کا ثبوت چاہتے ہیں تو ابن ابی حمزہ نے حضرت علی سے جو روایت کی ہے، اسے دیکھئے وہ کہتا ہے کہ حضرت علی نے فرمایا "اگر میں چاہوں تو اُم القرآن (سورہ فاتحہ) کی تفسیر سے ستر اونٹ لاد دوں۔ اسی طرح ابو طفیل سے مروی ہے کہ میں نے حضرت علی کو خطبہ دیتے سنا وہ کہہ رہے تھے کہ مجھ سے سوال کرو۔ خدا کی قسم، تم کسی چیز کے بارے میں سوال کرو، میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کا جواب دوں گا۔ مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں پوچھو، خدا کی قسم۔ اس کی کوئی آیت نہیں کہ میں اس کے متعلق یہ نہ جانتا ہوں کہ وہ دن کو اتری تھی یا رات کو، میدان میں اتری تھی یا پہاڑ میں، ان دو روایات کا مجرد نقل کر دینا ہی کافی ہے۔ ان پر کسی قسم کی رائے زنی کی ضرورت نہیں۔

ابن عباس سے اتنا کچھ مروی ہے کہ اس کا شمار نہیں۔ قرآن کی کوئی آیت ایسی نہیں، جس کے بارے میں ان کے ایک یا ایک سے زیادہ اقوال نہ ہوں۔ اور ان سے اتنے زیادہ لوگوں نے روائتیں کی ہیں کہ ان کا کوئی حد وحساب نہیں۔ ناقدین نے مجبور ہو کر ان کے راویوں کے سلسلے میں چھان بین کی بعض کو انہوں نے ثقہ مانا اور بعض کو مجروح قرار دیا۔ مثال کے طور پر ان میں سے معاویہ بن صالح عن علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس کا سلسلہ روایت سب سے بہتر ہے اور بخاری نے اس پر اعتماد کیا ہے۔ جویبر عن ضحاک عن ابن عباس کا سلسلہ روایت غیر پسندیدہ ہے۔ ابن جریج نے صحت کا پورا پورا لحاظ نہیں رکھا۔ اور اس نے ہر آیت کے متعلق جو صحیح اور غیر صحیح روایت تھی، وہ بیان کر دی۔ کلبی عن ابی صالح عن ابن عباس سب سے کمزور سلسلہ روایت ہے اور اگر اس کے ساتھ محمد بن مروان السدی الصغیر کی روایت بھی شامل ہو، تو اکثر صورتوں میں یہ کذب ہوتا ہے۔

ابن عبدالحکم کے طریقہ سے مروی ہے کہ میں نے امام شافعی کو کہتے سنا کہ ابن عباس سے سو سے زیادہ احادیث ثابت نہیں[1]۔ اگر یہ قول صحیح ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ موضوع روایات گھڑنے والوں نے کس قدر روایات گھڑیں اور اس معاملے میں لوگوں کی جرأت کس حد تک پہنچ گئی تھی

وضعِ روایات کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ آپ اکثر ابن عباس سے دو روایتیں مروی دیکھیں گے۔ وہ باہم متناقض ہوں گی اور ان دونوں کا ابن عباس کی طرف انتساب کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ابن جریر طبری میں اس ارشادِ ربانی "فخذ اربعۃ من الطیر فصرھن الیک ثمّ اجعل علی کل جبلٍ منھن جزءاً ثمّ ادعھن یاتینک سعیاً" کی تفسیر کے ذیل میں معاویہ عن علی ابن ابی طلحہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ یہ ایک مثال ہے۔ نیز ابن جریر میں ہے کہ (حضرت ابراہیمؑ کو حکم ہوا)

---

[1] الاتقان جزء ۲ صفحہ ۲۲۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرو، پھر انہیں چار حصوں میں تقسیم کرو، اور ہر چوتھا حصہ ادھر اُدھر رکھو، پھر انہیں بلاؤ، وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ اس کے کچھ آگے یہ بھی کہا ہے محمد بن سعد نے ہم سے بیان کیا، ان کو ان کے والد نے کہا ان کے والد کو ان کے چچا نے کہا۔ ان کے چچا کا بیان ہے کہ مجھ سے میرے والد نے کہا اور ان سے ان کے والد نے ابن عباس سے روایت کی کہ صُرھُنّ سے مراد اوثقھن[1] ہے الخ۔ غرض ایک جگہ صُرھُنّ کے معنی قطعھن کہا گیا ہے، اور دوسری جگہ اوثقھن[2] اب یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ ایک وقت میں انہوں نے ایک تفسیر کی، اور دوسرے وقت میں دوسری تفسیر کی۔ ابن جریر کی تفسیر میں ایسی مثالیں بکثرت ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود سچی بات یہ ہے کہ یہ موضوع تفسیر بھی علمی قدر و قیمت سے خالی نہیں یہ وضعِ تفسیر محض تک بندی نہیں تھی، بلکہ اکثر اوقات یہ نتیجہ ہوتی تھی مستقل علمی اجتہاد کا۔ ہاں اس میں اگر کوئی چیز ایسی تھی، جس کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی تو وہ حضرت علی اور حضرت ابن عباس کی طرف اس کی نسبت تھی۔

ابن عباس وغیرہ سے تفسیر کے سلسلے میں جو کچھ مروی ہے، اس پر اگر ہم عمومی نظر ڈالیں تو اس کے تین ماخذ ملتے ہیں، جن کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی احادیث۔ ان واقعات کی روایات جو صحابہ کے سامنے ہوئے، اور وہ آیات کی وضاحت کرتے ہیں۔ صحابہ کا اجتہاد جس میں وہ ادبِ جاہلی اور عربوں کی زبان اور ان کی عہدِ جاہلیت اور صدرِ اسلام کی عادات سے اپنی واقفیت اور اسرائیلیات وغیرہ پر اعتماد کرتے تھے۔

دورِ تابعین

صحابہ کرام کے بعد بعض تابعین نے ان صحابہ سے جن کا ہم ذکر کر آئے ہیں، تفسیر کی روایت کی، اور اس میں مشہور ہوئے۔ ابن عباس سے سب سے زیادہ مجاہدؒ، عطاء بن ابی رباحؒ، عکرمہ مولیٰ ابن عباس اور سعید بن جبیر نے روایت کی ہے۔ یہ چاروں مکہ میں ان کے شاگرد تھے اور

---

[1] ابن جریر جزء ۳ صفحہ ۳۴-۳۵

[2] قطعھن، انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرو، اوثقھن۔ انہیں اپنے ساتھ عادی بنالو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سب کے سب موالی تھے، ابن عباس سے روایات کی کثرت اور قلت کے اعتبار سے ان کے مختلف درجے ہیں، اسی طرح ان کے ثقہ ہونے کے متعلق بھی علماء نے مراتب قائم کئے ہیں۔ مجاہد نے ابن عباس سے سب سے کم روایتیں کی ہیں، اور وہ سب سے زیادہ ثقہ ہیں۔ اسی لئے امام شافعی، امام بخاری اور دوسرے اہل علم ان کی تفسیر پر اعتماد کرتے ہیں، لیکن بعض علماء مجاہد سے تفسیر کی روایات نہیں لیتے۔ ابن سعد "طبقات" میں لکھتے ہیں "اعمش سے پوچھا گیا کہ لوگ مجاہد کی تفسیر سے کیوں پہلوتہی کرتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ اہل کتاب سے پوچھا کرتے تھے"[1] لیکن ہمارے نزدیک کسی نے بھی مجاہد پر ان کے عدم ثقہ ہونے کا الزام نہیں لگایا۔ اسی طرح عطاء اور سعید میں سے بھی ہر ایک ثقہ اور صادق تھے باقی رہے عکرمہ، تو انہوں نے ابن عباس سے سب سے زیادہ روایت کی ہیں، اور وہ ابن عباس کے موالی تھے وہ اصلاً مغرب (شمالی افریقہ) کے رہنے والے بربر تھے۔ ان کے ثقہ ہونے میں علماء میں اختلاف ہے۔ چنانچہ بعض علماء تو ان پر اعتماد کرتے ہیں، اور نہ ان سے روایت کرتے ہیں۔ امام بخاری نے ان کو ثقہ مانا ہے اور ان سے روایت کی ہے۔ بعض کی رائے تھی کہ وہ اپنے علم میں بڑی جرأت رکھتے ہیں اور ان کو زعم ہے کہ قرآن میں جو کچھ ہے وہ اسے جانتے ہیں۔ سعید بن المسیب سے ایک شخص نے قرآن کی ایک آیت کے معنی پوچھے۔ آپ نے کہا کہ مجھ سے قرآن کی آیت کے معنی نہ پوچھو اس سے یعنی عکرمہ سے پوچھو جسے یہ زعم ہے کہ قرآن کی کوئی چیز اس سے مخفی نہیں[2]

تفسیر میں عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں میں سے عراق میں مسروق بن اجداع مشہور ہوئے یہ عربی النسل تھے، اور ہمدان کے تھے۔ بڑے پرہیزگار، زاہد اور ثقہ تھے۔ کوفہ میں رہتے تھے مشکل مسائل میں قاضی شریح ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ اسی طرح بصرہ میں قتادہ بن دعامہ السدوسی مشہور ہوئے۔ وہ نابینا تھے۔ وہ بھی عربی النسل تھے اور بصرے میں رہتے تھے۔ تفسیر میں ان کی شہرت عربی زبان میں مہارت کی وجہ سے تھی۔ موصوف عربی شاعری، عربوں کے مشہور واقعات اور ان کے انساب کے بارے میں وسیع معلومات رکھتے تھے۔ وہ ثقہ تھے، لیکن قضاء و قدر کے

---

[1] جزء ۵ صفحہ ۳۴۳ [2] تفسیر ابن جریر ج ۱ ص ۲۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسائل میں زیادہ الجھنے کی وجہ سے بعض علماء ان سے روایت کرنے میں احتراز کرتے تھے۔

اس عہد یعنی تابعین کے عہد میں اسرائیلیات اور نصرانیات سے تفسیر کی ضخامت بہت بڑھ گئی۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ یہود و نصاریٰ بکثرت اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ دوسرے یہودیت اور نصرانیت کے احوال و اخبار کے متعلق قرآن میں جو اشارے ہیں، ان کی تفصیل سننے کا دلوں میں میلان تھا۔ تفسیر ابن جریر میں بنی اسرائیل کے بارے میں وارد شدہ آیات کے متعلق کافی روایات ہیں، اور ان روایات کا بطل (ہیرو) وہب بن منبہ ہے وہ یہودیمن میں سے تھا۔ بعد میں اسلام لایا۔ وہ یہودی کتابوں کے مندرجات اور یہودیوں کے حالات جانچے پرکھے اور ان کی علمی تحقیق کئے بغیر بیان کیا کرتا۔ اور جیسا کہ ابن خلدون نے لکھا ہے چونکہ ان روایات سے کسی قسم کا کوئی حکم شرعی وغیرہ استنباط نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے مسلمانوں نے اس سے ان روایات کو لینے میں نرمی برتی۔ اسی طرح بہت سی آیات جو نصاریٰ کے بارے میں ہیں، ان کے متعلق تفسیر ابن جریر میں اکثر روایات ابن جریج سے مروی ہیں۔ اور یہ ابن جریج، عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج تھا۔ الذہبی تذکرۃ الحفاظ میں اسے رومی النسل بتاتے ہیں وہ اصلاً نصرانی تھا۔ اس کے متعلق بعض علماء نے لکھا ہے کہ وہ حدیثیں وضع کیا کرتا اور اس نے نوے عورتوں سے بطریق متعہ نکاح کیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے، "وہ پہلا شخص ہے جس نے اسلام میں سب سے پہلے کتاب تصنیف کی"[1] ابن جریج مذکور ۸۰ھ میں پیدا ہوا، اور ۱۵۰ کے لگ بھگ اس نے وفات پائی۔ اس نے بہت سے ملکوں کی سیاحت کی تھی اس کی پیدائش مکہ کی ہے، اس کے بعد وہ بصرہ، یمن اور بغداد گیا

صحابہ اور کبار تابعین کے عہد کے بعد علماء نے فن تفسیر میں کتابیں تالیف کرنی شروع کیں ان کے ہاں صرف ایک ہی طریقہ رائج تھا۔ اور وہ یہ کہ پہلے آیت دی جاتی۔ پھر صحابہ اور تابعین سے جو بھی اس کی تفسیر مروی ہوتی، اسے بالاسناد نقل کر دیا جاتا۔ سفیان بن عیینہ، وکیع بن الجراح اور عبدالرزاق وغیرہم کی اس نوع کی تفسیریں ہیں۔ گو یہ تفاسیر ہم تک نہیں پہنچیں، لیکن ان کے بعد جو طبقہ آیا، اس کی تفسیریں ہم تک پہنچی ہیں، ان میں سے سب سے مشہور ابن جریر الطبری متوفی

---

[1] ابن خلکان جزء ۱ صفحہ ۳۰۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس ضمن میں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس تمام عرصے میں ہر عہد میں جو علمی سرگرمیاں ہوتی تھیں، ان سے اس عہد کی تفسیر قرآن متاثر ہوتی رہی ہے۔ چنانچہ ایک عہد میں جو بھی خیالات، علمی نظریے اور مذہبی فرقے ہوتے، ان کا عکس اس عہد کی تفسیر میں ملتا ہے۔ اس کا سلسلہ ابن عباس سے لے کر شیخ محمد عبدہ تک چلا گیا ہے۔ اگر آپ کسی عہد میں لکھی ہوئی تفسیروں کو جمع کریں تو آپ ان سے اس عہد کی علمی سرگرمیوں اور اس میں جس قسم کے افکار و آراء کو فروغ تھا، انہیں معلوم کر سکتے ہیں۔

صحابہ اور تابعین اولین سے تفسیر قرآن کے سلسلے میں جو کچھ مروی ہے، اگر آپ اس پہ غور کریں، تو دیکھیں گے کہ وہ کسی آیت کی تفسیر کرتے وقت اس آیت کے جو لغوی معنی ان کی سمجھ میں آتے ہیں، ان کی مختصراً وضاحت کر دیتے ہیں مثال کے طور پر "غیر متجانف لاثم" کی تفسیر غیر متعرض لمعصیۃ کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد "وان تستقسموا بالازلام" کی تفسیر یوں کرتے — عہد جاہلیت میں جب اہل عرب میں سے کوئی سفر کا ارادہ کرتا، تو تیر سے فال نکالتا، اگر فال نکل آتی تو کہتا کہ مجھے سفر کی اجازت ہوئی ہے، اور اگر میں سفر کروں گا، تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گا۔ اسی طرح جب اسے سفر نہ کرنا ہوتا تو تیر سے فال نکالتا، اور اگر سفر نہ کرنے کی فال نکلتی تو اسے یقین ہو جاتا کہ اس سفر میں اس کے لئے بھلا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ اگر صحابہ اور تابعین اولین اس پر کچھ اور اضافہ کرنا چاہتے، تو آیت کی شان نزول کے متعلق جو کچھ مروی ہوتا، اسے بیان کر دیتے۔ ان کے بعد یہود اور نصاریٰ سے روایات لینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ صحابہ اور تابعین اولین کی تفسیروں میں آپ کسی فقہی حکم کے استنباط اور کسی مذہبی فرقے کی تائید کے آثار نہیں پائیں گے۔ ان کے بعد جو دور آیا، اور اس میں قضاء و قدر وغیرہ کی بحثیں شروع ہوئیں، تو آپ تفسیر کو ان مذاہب کے خیالات سے بھرا ہوا پائیں گے۔ چنانچہ اس دور میں ہر ایک جبر و قدر کے بارے میں اپنے مخصوص فرقے کے نقطہ نظر سے قرآن کی تفسیر کرنے لگ گیا۔ اس کے بعد جب فقہی سرگرمیاں عام ہوئیں تو آپ مفسرین میں سے فقہاء کو دیکھتے ہیں کہ وہ تفسیر کرتے وقت آیات سے جو فقہی احکام مستنبط ہوتے ہیں، ان سے بحث کرتے ہیں اسی طرح نحو و بلاغت کے قواعد اور اصول اخلاق کے سلسلے میں ہوا۔

© rasailojaraid.com